بڑی مصیبت پڑے گی۔"

"وہ کیسے؟ — " فائزہ نے چڑ کر کہا۔

"میں جو وہاں گئی اور وہاں کی مخلوق مجھے مختلف نظر آئی تو دو ہی صورتیں ہیں یا تو میں اپنے آپ کو سچا سمجھنے کے لیے ان پر نکتہ چینی کروں گی۔"

"تو کر لینا نکتہ چینی۔ سبھی کرتے ہیں سفید آدمی پر نکتہ چینی اور پھر بھی اس کی تقلید کرتے ہیں۔"

"ناں ناں ناں ناں — وہ بھی اللہ کی مخلوق ہے — کون جانے رب کی نظر میں کون اچھا ہے کون بُرا —"

"پھر جب آپ اتنی لبرل ہیں دادی تو چلیں ناں —"

"یہ کیا لفظ بولا تُو نے —"

"لبرل — فراخ دل —"

"ہاں بھئی جو میں فراخدل ہو گئی تو دوسری صورت پیدا ہو گی کہ میں ان کی ماننے لگوں گی — مروّت کے ساتھ — رعب میں آ کر — اور پھر کون جانے کس وقت میں اپنے نیک انجام سے بچھڑ جاؤں —"

"تو آپ کا خیال ہے وہ لوگ غلط رہتے ہیں غلط سوچتے ہیں —"

"ہائے لڑکی یہ میں نے کب کہا — جو یہاں ہے ٹھیک ہے — صرف کوّا ہنس کی چال چلے تو اس کا حسنِ خاتمہ نہیں ہوتا۔"

ہیمر سمتھ کے سب وے پر بیٹھی فائزہ سوچ رہی تھی کوّوں کے متعلق، ہنسوں کی چال کے متعلق — اور بار بار نائیجل اس کی آنکھوں کے سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ اس کی مونگ پھلی کا پیکٹ ختم ہونے کو آ رہا تھا لیکن پکاڈلی جانے والی ٹرین ابھی نہیں آئی تھی۔

نائیجل کی آنکھیں اتنی ہلکی نیلی تھیں کہ کبھی کبھی بالکل زرد سی نظر آتیں۔ اس کے ہونٹ،

رخسار، ہاتھ سب پلاسٹک کی طرح گلابی تھے۔ وہ مہذب لوگوں کی طرح بہت آہستہ بولتا تھا اور بہت تیز چلتا تھا۔

سب سے پہلے فائزہ کی ملاقات نائجل سے اس دن ہوئی جب وہ شراب خریدنے کے لیے گلاب سٹورز میں پہلی مرتبہ آیا اس دن ابا گلاب دین کسی کام کی وجہ سے باہر گیا ہوا تھا۔ اور حمیرا بیرونی کاؤنٹر پر تولنے، حساب کتاب کرنے اور مسکرانے میں مشغول تھی۔

نائجل نے ڈھائی پونڈ کی بوتل اور چند کے ڈبے خریدے پھر بہت آہستہ سے بولا: "کیا آپ قیمت یہاں وصول کریں گی؟"

"نہیں۔ باہر میری بہن کاؤنٹر پر ہے۔"

سر کے اشارے سے نائجل نے باقی باقی کہا اور چلنے لگا۔ پھر پتہ نہیں اس کے دل میں کیا آئی کہ وہ رک کر بولا:

"تم ایک خوبصورت ایشیائی لڑکی ہو — ایسی ہسپانوی رنگت بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔"

اکتیس سال کی عمر میں اگر کوئی ایسی بے ساختہ بات کہہ دے تو دل میں اچانک خوشیوں کی پنیری لگ جاتی ہے اور ایسی زندگی جو بارہ سال سے روٹین کی نذر ہو، یکدم نئے پھوٹتے ہوئے چشمے کی طرح ابلنے لگتی ہے۔

ایسے ہی نائجل دوسرے چوتھے شراب لینے آتا رہا۔ اب ان دونوں میں مسکراہٹوں کا لین دین عام ہو گیا تھا۔ پھر بھی دونوں یکدم اس بات سے بہت آگاہ ہو گئے تھے کہ وہ قطعی طور پر مختلف ہیں۔ جو فرق اب تک انہیں محسوس نہ ہوتے تھے اب کھل کر سامنے آ گئے تھے اور وہ دونوں پہلی مرتبہ کلچرل شاک سے خوفزدہ تھے۔ اسی ری ایکشن کی شکل میں وہ ایکدن الجھ گئے۔

وطن میں تھی تو رشتہ داری دوست داری میں حتی الوسع دل رکھنے کی خاطر جھوٹ بول بول کر

وہ اچھی خاصی منافق ہو چکی تھی لیکن یہاں چونکہ رشتوں کا پاس نہ تھا اس لیے وہ بڑی سچی اور کھری ہو چکی تھی اور اس بات کا بھی اسے علم نہ تھا کہ یہ تبدیلی اس میں کب اور کیسے آئی؟

ہوا یوں کہ نائیجل جس وقت دکان میں داخل ہوا وہ اخبار پڑھ رہی تھی۔ نائیجل نے اسے بلانے کی کوشش نہ کی اور وہ بھی اخبار کا ایک پیج دیکھنے لگا۔ پھر پتہ نہیں وہ دونوں کتنی دیر تک پڑھتے رہے کہ اچانک حمیرا شراب والے سکشن میں داخل ہوئی۔

'آپا ــــ میں ذرا ہمیر سمتھ جارہی ہوں خالہ جمیلہ کے پاس ــــ آپ باہر آجائیں ــــ'

'اچھا ــــ'

دیر تک نائیجل اچھا اچھا کرتا رہا اور مسکراتا رہا۔ پھر پتہ نہیں اسے کیا ہوا کہ اس نے اخبار الٹ کر فائزہ کے سامنے رکھا۔ اس صفحے پر ہیروئن سمگل کرنے کے جرم میں ایک پاکستانی کی تصویر چھپی تھی اور ساتھ کس طرح اور کیسے وہ پکڑا گیا تھا، اس کی تمام تفصیلات درج تھیں۔

'یہ تم لوگ ہیروئن کیوں سمگل کرتے ہو؟'

شراب کی دکان میں شراب بیچتے ہوئے وہ یکدم حیران رہ گئی۔

'اور تم لوگ جو صدیوں سے تھرڈ ورلڈ کو شراب بیچتے رہے ہو ــــ اپنی شراب کو خوبصورت رہنوں سے سجا کر، ان کی تصویریں چھاپ کر اتنی اشتہار بازی کرتے ہو وہ کچھ نہیں۔'

پہلی مرتبہ نائیجل کی آنکھیں گہری نیلی ہو گئیں۔

'شراب تباہ کن نہیں ہے۔ ہیروئن تو مار دیتی ہے ختم کر دیتی ہے۔'

'اور وہ لوگ جو سب وے سٹیشنوں پر شراب کے نشے میں اوندھے پڑے ہوتے ہیں وہ ــــ وہ ختم نہیں ہوتے!'

نائیجل کے پاس سائنسی تاویلیں تھیں۔ فائزہ کے پاس ایمانی انسانی تاویلیں تھیں۔

دونوں ٹھیک تھے ـــــ دونوں بے حد غلط بھی تھے ـــ پہلے الزامی گفتگو ہوئی۔ پھر جھگڑا ہوا اور اس کے بعد یکدم محبت کا جذبہ بیدار ہو گیا۔

کبھی کبھی شدید ٹکراؤ ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ اپنی بقاء کا مسئلہ بھی کھڑا ہو جاتا ہے۔ اب نانچل اور فائزہ کو ایک دوسرے سے وابستگی اپنی اپنی بقاء کی شکل میں نظر آئی اور وہ دونوں گلاب سٹورز سے باہر نکل کر بھی ملنے لگے۔

پھر ملاقات سے وہی نتیجہ نکلا کہ انہیں ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ یک جان اور یک قالب بن جائیں لیکن جب جذبے سے پرے دنیاوی طور پر معاملات طے ہونے لگے تو سب سے بڑا مسئلہ مذہب کا نکل آیا۔ نانچل اپنا دیس، زبان، لباس، سب کچھ بدلنے کو تیار تھا، صرف وہ اپنا مذہب بدلنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ مذہب سوائے کرسمس منانے کے اس کے کام بھی نہ آتا تھا۔ وہ چرچ، کرائسٹ اور بائبل سب کو سنجیدگی سے نہیں لیتا تھا۔ پھر بھی اتنی بڑی تبدیلی کے لیے اس کی روح رضامند نہ تھی۔

دو روز پہلے جب وہ جمیلہ خالہ کے پاس، ہیمر سمتھ آئی تھی تو نانچل اسے ملنے آیا تھا۔ شام تھی اور وہ دونوں خالہ کے اپارٹمنٹ میں بیٹھے تھے۔ فائزہ کا خیال تھا کہ نانچل کبھی بھی اسے ملنے ہیمر سمتھ نہیں آئے گا کیونکہ آج تک وہ کبھی ان کے گھر نہیں گیا تھا لیکن شام کو اچانک نانچل کو خالہ کے اپارٹمنٹ میں دیکھ کر فائزہ کا دل گرم سویٹر کے اندر پھیلنے لگا گھر پر کوئی نہ تھا۔ خالہ، خالو، ان کی دونوں بیٹیاں، سب کالجوں پر تھے ـــ وہ کھڑکی میں کھڑی ہو کر نیچے جلنے والی خوبصورت بتیوں کو دیکھنے لگی۔ سڑک کنارے بنے ہوئے چرچ کا چھوٹا سا باغیچہ گلاب کے پھولوں سے بھرا پڑا تھا۔

وہ دونوں چپ تھے!

لباس، زبان، مذہب، کلچر، موسم۔ اتنے سارے فاصلوں کی چپ ان کے ہونٹوں پر تھی۔

بڑی دیر کے بعد نائیجل نے کہا:

"میں تمہارے والد سے ملنا چاہتا ہوں"۔

"کیوں۔ کس لیے؟"

"شاید اُن میں تم سے زیادہ عقل ہو ــــ" مسکرا کر نائیجل نے کہا۔

فائزہ کے سامنے اپنا باپ آ گیا جو پاکستان سے اس لیے بھاگا تھا کہ وہاں غریبی تھی اور یہاں اس لیے پھنس گیا تھا کہ یہاں امیری تھی۔

"فیصلہ تو بالآخر میرا ہو گا نائیجل"

"تم تو کہا کرتی ہو کہ تمہارے ملک میں شادیاں ماں باپ کی مرضی سے طے ہوتی ہیں"۔

"لیکن یہ ہمارا ملک نہیں ہے ناں نائیجل"۔ فائزہ بولی۔

"تمہارے پاس برٹش پاسپورٹ ہے ــــ"

"ہاں ہے"۔

"پھر تم وہ تمام حقوق انجوائے کرتی ہو جو یہاں کے کسی نیشنل کے ہیں"۔

"لیکن میں وہ تمام فرائض ادا نہیں کر سکتی جو یہاں کے مقامی ادا کرتے ہیں"۔

وہ دونوں دیر تک خاموش رہے۔ پھر نائیجل نے اٹھتے ہوئے کہا:

"سنو فائزہ! میں مذہب تبدیل نہیں کر سکتا کیونکہ ــــ اس لیے نہیں کہ میں عیسائی مذہب میں یقین رکھتا ہوں بلکہ صرف اس لیے کہ میں اسلام کو جانتا ہی نہیں"۔

"آہستہ آہستہ جاننے لگو گے ــــ"

"ہو سکتا ہے آہستہ آہستہ جاننے کے پروسیس میں میں اسلام کو قبول کرنے سے ہی انکار کر دوں۔ ــــ میں مذہبی آدمی ہی نہیں ہوں فائزہ ــــ میری ماں نے مجھے پرورش نہیں کیا۔ وہ کام کرتی تھی ــــ اور ہمیشہ اتنی تھکی ہوئی لوٹتی تھی کہ اس کا چہرہ دیکھ کر اس سے کوئی بھی بات نہیں کی جا سکتی تھی ــــ ہم دونوں فقط ــــ کبھی کبھی ایک دوسرے کو

محبت کی نگاہ سے دیکھ لیتے تھے۔ اس نے مجھے تجربے سے سیکھنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا تھا ـــ میں نے سب کچھ بڑے مہنگے داموں سیکھا ہے ـــ لیکن میں جانتا ہوں کہ میں مذہب کے متعلق کچھ نہیں سیکھ سکوں گا ـــ مذہب تو کسی گود سے سیکھا جاتا ہے۔ میں تو گودی میں پلا ہی نہیں ـــ"

فائزہ چاہتی تھی کہ وہ آگے بڑھ کر نائیجل کو اپنی بانہوں میں لے لے لیکن اس وقت وہ مضبوط رہنا چاہتی تھی۔

"لیکن ـــ پھر تو ـــ شادی نہیں ہو سکے گی نائیجل ـــ"

"ہم سول میرج کر سکتے ہیں فائزہ ـــ"

جب عورت بتیس سال بتیس دن کی ہو چکی ہو اور اس کی زندگی میں ایک عرصہ سے گیت، چاندنی اور باغ بے معنی ہو گئے ہوں تو اچانک نیلی آنکھوں کا اس نہتی پہ وہی اثر ہوتا ہے جو فائزہ پر ہوا۔

وہ سول میرج پر رضامند ہو گئی۔

اسے پکاڈلی تک ہی تو جانا تھا۔

پکاڈلی سب وے سے تھوڑی ہی دور نائیجل کتابوں کی دکان میں کام کرتا تھا۔ وہاں پہنچ کر فائزہ کو بڑی ہمت کے ساتھ آخری بار نائیجل کو خدا حافظ کہنا تھا۔

پتہ نہیں کیوں ساری رات وہ بے قرار رہی تھی۔ اسے ڈر لگ رہا تھا کہ اگر وہ نائیجل سے شادی کرے گی تو اس کا حسنِ خاتمہ نہیں ہو گا ـــ اسے یہ خوف نہیں تھا کہ وہ اور نائیجل تھوڑی دیر کے بعد بڑی بڑی لڑائیاں لڑنے لگیں گے اور چھوٹی چھوٹی بات پر لمبے لمبے مباحثے ہوں گے بلکہ وہ جانتی تھی کہ جس طرح وہ دادی کی ساری تعلیم بھول گئی تھی اسی طرح ہر روز دن چڑھتے ہی نائیجل سے اور زیادہ پیار کرے گی۔ ہر روز پہلے دن سے زیادہ اس کے رنگ میں رنگی جائے گی۔ اسے اپنا نام، مذہب، ملک، سب کچھ بھول جائے گا اور

وہ اپنے آپ کو نا ئیجل سمجھنے اور بنانے میں اتنی دور نکل جائے گی کہ حسنِ خاتمہ کا تصور بھی اس کے ساتھ نہ رہے گا۔

آخر بتیس سال بتیس دن کی عورت کے پاس اپنی روٹین سے نکلنے کا یہی تو ایک موقع تھا۔

دُور کھلے سب وے سے ٹرین کی آواز آ رہی تھی۔

مونگ پھلی کا پیکٹ ختم ہو چکا تھا۔

اسے پکاڈلی تک ہی تو جانا تھا ـــــ آخری بار نائیجل سے ملنے کے لیے

بغیر وجہ بتائے شادی سے انکار کرنے کے لیے۔

ٹرین رکی۔ اس نے اپنے بیگ کو مضبوطی سے تھاما اور اندر داخل ہوئی۔ پھر ایک سیٹ پر بیٹھتے ہوئے فائزہ نے سوچا:

"میرے مولیٰ ـــــ یہ بھی کیسی آزمائش بھری زندگی ہے۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ مغرب میں زندگی آسان ہوتی ہے ـــــ پھر یہ کیسا مغرب ہے اور یہ کیسی زندگی ہے کہ مجھے لگتا ہے کہ میں صدیاں جی چکی ہوں۔ میرا فوسل بن چکا ہے لیکن زندگی ختم ہونے میں نہیں آتی ـــــ میرے آقا ـــــ یہ سب کیا ہے ـــــ وہاں غریبی کے دکھ تھے۔ یہاں امیری نے گلہ و بار کھا ہے ـــــ وہاں رسوم کی قید سے زندگی دم گھٹنت تھی۔ یہاں آزادی ہر جگہ بہائے لیے جاتی ہے جیسے کاغذ کا پرزہ شدید آندھیوں میں آوارہ ہو ـــــ یہ سب کیا ہے یہاں اور وہاں ـــــ کیا ہے میرے خدا ـــــ حسنِ خاتمہ کب ہو۔ کہاں ہو۔ کیسے ہو!"

توبہ شکن

بی بی رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی۔ آنسو بے روک ٹوک گالوں پر نکل کھڑے ہوئے تھے۔
"مجھے کوئی خوشی راس نہیں آتی۔ میرا نصیب ہی ایسا ہے۔ جو خوشی ملتی ہے ایسے ملتی ہے
۔گویا کوکا کولا کی بوتل میں ریت ملا دی ہو کسی نے۔"
آنکھیں سرخ ساٹن کی طرح چمک رہی تھیں اور سانسوں میں دمے کے اکھڑے پن کی
سی کیفیت تھی۔ پاس ہی پپو بیٹھا کھانس رہا تھا۔ کالی کھانسی نامراد کا ہتا جب بھی ہوتا بیچارے
کا منہ کھانس کھانس کر بینگن سا ہو جاتا۔ منہ سے رال بہنے لگتا اور ہاتھ پاؤں اینٹھ سے
جاتے۔ امی سامنے چپ چاپ کھڑکی میں بیٹھی ان دنوں کو یاد کر رہی تھیں جب وہ ایک
ڈی سی کی بیوی تھیں اور ضلع کے تمام افسروں کی بیویاں ان کی خوشامد کیا کرتی تھیں۔ وہ
بڑی بڑی تقریبوں میں مہمانِ خصوصی ہوا کرتیں، اور لوگ ان سے درخت لگواتے،
ربن کٹواتے ـــ۔ انعامات تقسیم کرواتے۔

پروفیسر صاحب ہر تیسرے منٹ مدھم سی آواز میں پوچھتے ـــ "لیکن ـــ
آخر بات کیا ہے بی بی ـــ ہوا کیا ہے ـــ"
وہ پروفیسر صاحب کو کیا بتاتی کہ دوسروں کے اصول اپنانے سے اپنے اصول بدل

نہیں جاتے صرف ان پر غلاف بدل جاتا ہے۔ ستار کا غلاف، مشین کا غلاف تکیے کا غلاف ـــــ درخت کو ہمیشہ جڑوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اسے کرسمس ٹری کی طرح یونہی داب داب کر مٹی میں کھڑا کر دیں گے تو کے دن کھڑا رہے گا۔ بالآخر تو گرے ہی گا۔

وہ اپنے پروفیسر میاں کو کیا بتاتی کہ اس گھر سے رشتہ تڑوا کر جب وہ بانو بازار پہنچی تھی اور جس وقت وہ ربڑ کی ہوائی چپلوں کا بھاؤ چار آنے کم کروا رہی تھی تو کیا ہوا تھا؟

اس کے بوائی پھٹے پاؤں ٹوٹی چپلی میں تھے۔ ہاتھوں کے ناخنوں میں برتن مانجھ مانجھ کر کیچ جمی ہوئی تھی۔ سانس میں پیاز کے باسی لچھوں کی بو تھی۔ قمیض کے بٹن ٹوٹے ہوئے اور دوپٹے کی لیس ادھڑی ہوئی تھی۔ اس ماندے حال جب وہ بانو بازار کے ناکے پر کھڑی تھی تو کیا ہوا تھا؟

یوں تو دن چڑھتے ہی روز کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا تھا پر آج کا دن بھی خوب رہا۔ اِدھر پچھلی بات بھولتی تھی ادھر نیا تھپڑ لگتا تھا۔ ادھر تھپڑ کی ٹیس کم ہوتی تھی۔ ادھر کوئی چٹکی کاٹ لیتا تھا۔ جو کچھ بانو بازار میں ہوا وہ تو فقط فل سٹاپ کے طور پر تھا۔

صبح سویرے ہی سنتو جمعدارنی نے برآمدے میں گھستے ہی کام کرنے سے انکار کر دیا۔ رانڈ سے اتنا ہی تو کہا تھا کہ نالیاں صاف نہیں ہوتیں۔ ذرا دھیان سے کام کیا کر۔ بس جھاڑو وہیں پٹخ کر بولی:

"میرا حساب کر دیں جی ـــــ"

کتنی خدمتیں کی تھیں بدبخت کی۔ صبح سویرے تام چینی کے مگ میں ایک رس کے ساتھ چائے۔ رات کے جھوٹے چاول اور باسی سالن روز کا بندھا ہوا تھا۔ چھ مہینے کی نوکری میں تین نائلون جالی کے دوپٹے۔ امی کے پرانے سلیپر اور پروفیسر صاحب کی قمیص لے گئی

تھی۔ کسی کی جرأت نہ تھی کہ اسے جمعدارنی کہہ کر بلا لیتا۔ سب کا سنتو سنتو کہتے منہ سوکھتا تھا۔ پر وہ تو طوطے کی سگی پھوپھی تھی ــــ ایسی سفید چشم واقع ہوئی کہ ذرا احساب کرا، جھاڑو بغل میں داب، سر پر سلفچی دھر ــــ یہ جا وہ جا۔

بی بی کا خیال تھا کہ تھوڑی دیر میں آ کر پاؤں پکڑے گی۔ معافی مانگے گی اور ساری عمر کی غلامی کا عہد کرے گی۔ بھلا ایسا گھر اسے کہاں ملے گا۔ پر وہ تو ایسی دفان ہوئی کہ دوپہر کا کھانا پک کر تیار ہو گیا پر سنتو مہارانی نہ لوٹی۔

سارے گھر کی صفائیوں کے علاوہ غسلخانے بھی دھونے پڑے اور کمروں میں ٹاکی بھی پھیرنی پڑی۔ ابھی کمر سیدھی کرنے کو لیٹی ہی تھی کہ ایک مہمان بی بی آ گئیں۔ منے کی آنکھ مشکل سے لگی تھی۔ مہمان بی بی حسنِ اتفاق سے ذرا اونچا بولتی تھیں۔ منا اٹھ بیٹھا اور اٹھتے ہی کھانسنے لگا۔ کالی کھانسی کا بھی ہر علاج کر دیکھا تھا پر نہ تو ہومیو پیتھی سے آرام آیا نہ ڈاکٹری علاج سے۔ حکیموں کے کشتے اور معجون بھی رائیگاں گئے۔ بس ایک علاج رہ گیا تھا اور یہ علاج سنتو جمعدارنی بتایا کرتی تھی۔ بی بی! کسی کالے گھوڑے والے سے پوچھو کہ منے کو کیا کھلائیں۔ جو کہے سو کھلاؤ۔ دنوں میں آرام آ جائے گا۔

لیکن بات تو مہمان بی بی کی ہو رہی تھی۔ ان کے آنے سے سارے گھر والے اپنے اپنے کمروں سے نکل آئے اور گرمیوں کی دوپہر میں خورشید کو ایک عدد بوتل لینے کے لیے بھگا دیا گیا۔ ساتھ ہی اتنا سارا سودا اور بھی یاد آ گیا کہ پورے پانچ روپے دینے پڑے۔

خورشید پورے تین سال سے اس گھر میں ملازم تھی۔ جب آئی تھی تو بغیر دوپٹے کے کھوکھے تک چلی جاتی تھی اور اب وہ بالوں میں پلاسٹک کے کلپ لگانے لگی تھی۔ چوری چوری پیروں کو کیوٹیکس اور منے کو پاؤڈر لگانے کے بعد اپنے چہرے پر بے بی پاؤڈر استعمال کرنے لگی تھی۔ جب خورشید موٹی ململ کا دوپٹہ اوڑھ کر ہاتھ میں خالی سکوائش کی بوتل لے کر سراج کے کھوکھے پر پہنچی تو سڑکیں بے آباد سی ہو رہی تھیں۔ پانچ روپے کا نوٹ جو اس کے ہاتھ میں

بنی سی بن گیا تھا، نقدی والے ٹین کی ٹرے میں دھرتی ہوئی خورشید بولی:

'ایک بوتل مٹی کا تیل دو ـــ دو سات سو سات کے صابن ـ تین پان سادہ ـــ چار میٹھے ـــ ایک نکی سفید دھاگے کی ـــ دو لولی پاپ اور ایک بوتل ٹھنڈی ٹھار سیون اپ کی ـــ'

روڑی کوٹنے والا انجن بھی جا چکا تھا اور کولتار کے دو تین خالی ڈرم تازہ کوٹی ہوئی سڑک پر اوندھے پڑے تھے۔ سڑک پر سے حدت کی وجہ سے بھاپ سی اٹھتی نظر آتی تھی۔

داتی کی لڑکی خورشید کو دیکھ کر سراج کو اپنا گاؤں دھلا یاد آ گیا۔ دھلے میں اسی وضع قطع، اسی چال کی سیندوری سے رنگ کی نوبالغ لڑکی حکیم صاحب کی ہوا کرتی تھی۔ ٹانسے کا برقعہ پہنتی تھی۔ انگریزی صابن سے منہ دھوتی تھی اور شاید خمیرہ گاؤزبان اور کشتہ مروارید بمعہ شربت صندل کے اتنی مقدار میں پی چکی تھی کہ جہاں سے گزر جاتی سیب کے مربّے کی خوشبو آنے لگتی۔ گاؤں میں کسی کے گھر کوئی بیمار پڑ جاتا تو سراج اس خیال سے اس کی بیمار پرسی کرنے ضرور جاتا کہ شاید وہ اسے حکیم صاحب کے پاس دوا لینے کے لیے بھیج دے۔ جب کبھی ماں کے پیٹ میں درد اٹھتا تو سراج کو بہت خوشی ہوتی۔ حکیم صاحب ہمیشہ اس نفخ کی مریضہ کے لیے دو پڑیاں دیا کرتے تھے۔ ایک خاکی پڑیا گلاب کے عرق کے ساتھ پینا ہوتی تھی اور دوسری سفید پڑیا سونف کے عرق کے ساتھ ـــ حکیم صاحب کی بیٹی عموماً اسے اپنے خط پوسٹ کرنے کو دیا کرتی۔ وہ ان خطوں کو لال ڈبے میں ڈالنے سے پہلے کتنی کتنی دیر سونگھتا رہتا تھا۔ ان لفافوں سے بھی سیب کے مربّے کی خوشبو آیا کرتی تھی۔

اس وقت داتی کرمو کی بیٹی گرم دوپہر میں اس کے سامنے کھڑی تھی اور سارے میں سیب کا مربّہ پھیلا ہوا تھا۔

پانچ روپے کا نوٹ نقدی والے ٹرے میں سے اٹھا کر سراج نے چھپی نظروں سے

خورشید کی طرف دیکھا اور کھنکار کر بولا ـــــ 'ایک ہی سانس میں اتنا کچھ کہہ گئی۔ آہستہ آہستہ کہو نا۔ کیا کیا خریدنا ہے؟"

'ایک بوتل مٹی کا تیل ـــ دو سات سو سات صابن ـــ تین پان سادہ، اچار میٹھے۔ ایک نکی بٹر فلائی والی سفید رنگ کی ـــ ایک بوتل سیون اپ کی ـــ جلدی کر، گھر مہمان آئے ہوئے ہیں"۔

سب سے پہلے نوسراج نے کھٹاک سے سبز بوتل کا ڈھکنا کھولا اور بوتل کو خورشید کی جانب بڑھا کر بولا:

'یہ تو ہو گئی بوتل اور ـــ"

"بوتل کیوں کھولی تُو نے ـــ اب بی بی جی ناراض ہوں گی ـــ"

"میں تو سمجھا کہ کھول کر دینی ہے ـــ"

"میں نے کوئی کہا تھا تجھے کھولنے کے لیے"۔

'اچھا اچھا بابا۔ میری غلطی تھی۔ یہ بوتل تُو پی لے میں ڈھکنے والی اور دے دیتا ہوں تجھے ـــ'

جس وقت خورشید بوتل پی رہی تھی، اس وقت بی بی کا چھوٹا بھائی اظہر ادھر سے گزرا۔ اسے سڑا سے بوتل پیتے دیکھ کر وہ مین بازار جانے کے بجائے الٹا چودھری کالونی کی طرف لوٹ گیا اور این ٹائپ کے کوارٹر میں پہنچ کر برآمدے ہی سے بولا:

"بی بی! آپ یہاں بوتل کا انتظار کر رہی ہیں اور وہ لاڈلی وہاں کھوکھے پر خود بوتل پی رہی ہے سڑا لگا کر ـــ"

بھائی تو اخبار والے کے فرائض سرانجام دے کر سائیکل پر چلا گیا لیکن جب دو روپے تیرہ آنے کی ریزگاری مٹھی میں دبائے، دوسرے ہاتھ میں مٹی کے تیل کی بوتل اور بغل میں سات سو سات صابن کے ساتھ سیون اپ کی بوتل لیے خورشید آئی تو سنتو جمعدارنی کے

حصے کا غصہ بھی خورشید پر ہی اترا۔

"اتنی دیر لگ جاتی ہے تجھے کھوکھے پر۔"

"بڑی بھیڑ تھی جی ــــ"

"سراج کے کھوکھے پر ــــ اس وقت؟"

"بہت لوگوں کے مہمان آئے ہوئے ہیں جی ــــ سمن آباد میں ویسے ہی مہمان بہت آتے ہیں ــــ سب نوکر، بوتلیں لے جا رہے تھے۔"

"جھوٹ نہ بول کمبخت! میں سب جانتی ہوں۔"

خورشید کا رنگ فق ہو گیا۔

"کیا جانتی ہیں جی آپ؟ ــــ"

"ابھی کھوکھے پر کھڑی تو ــــ بوتل نہیں پی رہی تھی۔"

خورشید کی جان میں جان آئی۔ پھر وہ بپھر کر بولی:

"وہ میرے اپنے پیسوں کی تھی جی ــــ آپ حساب کر دیں جی میرا ــــ مجھ سے ایسی نوکری نہیں ہوتی ــــ"

بی بی تو حیران رہ گئی۔

سنتو کا جانا گویا خورشید کے جانے کی تمہید تھی۔ لمحوں میں بات یوں بڑھی کہ مہمان بی بی سمیت سب برآمدے میں جمع ہو گئے اور کٹر ن بھر لڑکی نے وہ زبان درازی کی کہ جن مہمان بی بی پہ بوتل پلا کر رعب گانٹھنا تھا وہ اس گھر کو دیکھ کر قائل ہو گئیں کہ بد نظمی، بے ترتیبی اور بد تمیزی میں یہ گھر حرفِ آخر ہے۔

آناً فاناً مکان نوکرانی کے بغیر سُونا سُونا ہو گیا۔

ادھر جمعدارنی اور خورشید کا رنج تو تھا ہی، اوپر سے پپّو کی کھانسی دم نہ لینے دیتی تھی، جب تک خورشید کا دم تھا کم از کم اسے اٹھانے، پچکارنے والا تو کوئی موجود تھا۔ اب

کنگیر تو اچھوڑ چھاڑ کے بچے کو اٹھانا پڑتا۔ اسے بھی کالی کھانسی کا دورہ پڑتا تو رنگت بینگن کی سی ہو جاتی۔ آنکھیں سرخا سرخ نکل آتیں اور سانس یوں چلتا جیسے کٹی ہوئی پانی کی ٹیوب سے پانی رِس رِس کے نکلتا ہے۔

سارا دن وہ یہی سوچتی رہی کہ آخر اس نے کونسا گناہ کیا ہے جس کی پاداش میں اس کی زندگی اتنی کٹھن ہے۔ اس کے ساتھ کالج میں پڑھنے والیاں تو ایسی تھیں گویا ریشم پر چلنے سے پاؤں میں چھالے پڑ جائیں اور یہاں وہ کپڑے دھونے والے تھاپے کی طرح کرخت ہو چکی تھی۔ رات کو پلنگ پر لیٹتی تو جسم سے انگارے جھڑنے لگتے۔ بدبخت خورشید کے دل میں ترس آجاتا تو دو چار منٹ دُکھتی کمر میں مکیاں مار دیتی ورنہ اوئی آئی کرتے نیند آجاتی اور صبح پھر وہی سفید پوش غریبوں کی سی زندگی اور تندور میں لگی ہوئی روٹیوں کا سا سینک!

اُس روز دن میں کئی مرتبہ بی بی نے دل میں کہا:

"ہم سے اچھا گھر انہیں ملے گا تو دیکھیں گے۔ ابھی کل برآمدے میں آبیٹھی ہوں گی دونوں کالے منہ والیاں"

پر اسی دل میں اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس سے اچھا گھر ملے یا نہ ملے وہ دونوں اب لوٹ کر نہ آئیں گی۔

سارے گھر میں نظر دوڑاتی تو چھت کے جالوں سے لے کر رُکی ہوئی نالی تک اور ٹوٹی ہوئی سیڑھیوں سے لے کر اندر ٹپ ٹپ برسنے والی نلکے تک عجیب کسمپرسی کا عالم تھا، ہر جگہ ایک آنچ کی کسر تھی۔ تین کمروں کا مکان جس کے دروازوں کے آگے ڈھیلی ڈوروں میں دھاری دار پردے پڑے تھے، عجیب سی زندگی کا سراغ دیتا تھا۔ نہ تو یہ دولت تھی اور نہ ہی یہ غریبی تھی۔ ردی کے اخبار کی طرح اس کا تشخص ختم ہو چکا تھا۔

جب تک اباجی زندہ تھے اور بات تھی۔ کبھی کبھار مائیکہ جا کر کھلی ہوا کا احساس

پیدا ہو جاتا۔ اب تو ابا جی کی وفات کے بعد امی، اظہر اور منّی بھی اس کے پاس آ گئے تھے امی زیادہ وقت پچھلی پوزیشن کو یاد کر کے رونے میں بسر کرتیں ۔ جب رونے سے فراغت ہوتی تو وہ اڑوس پڑوس میں یہ بتانے کے لیے نکل جاتیں کہ وہ ایک ڈپٹی کمشنر کی بیگم تھیں اور حالات نے انہیں یہاں سمن آباد میں رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔

منّی کو مٹی کھانے کا عارضہ تھا۔ دیواریں کھرچ کھرچ کر کھوکھلی کر دی تھیں۔ نامراد سیمنٹ کا پکا فرش اپنی نرم نرم انگلیوں سے کرید کر دھر دیتی۔ بہت مرچیں کھلائیں۔ کونین ملی مٹی سے ضیافت کی۔ ہونٹوں پر دہکتا ہوا کوئلہ رکھنے کی دھمکی دی پر وہ شیر کی بچی مٹی کو دیکھ کر بری طرح ریکشہ خطمی ہوتی۔

اظہر جس کالج میں داخلہ لینا چاہتا تھا جب اس کالج کے پرنسپل نے تھرڈ ڈویژن کے باعث انکار کر دیا تو دن رات ماں بیٹا مرحوم ڈی سی صاحب کو یاد کر کے روتے رہے۔ ان کے ایک فون سے وہ بات بن جاتی جو پروفیسر فخر کے کئی پھیروں سے نہ بنی۔

امی تو دبی زبان میں کئی بار یہاں تک کہہ چکی تھیں کہ ایسا داماد کس کام کا جس کی سفارش ہی شہر میں نہ چلے۔ نتیجے کے طور پر اظہر نے پڑھائی کا سلسلہ منقطع کر لیا۔ پروفیسر صاحب نے بہت سمجھایا پر اُس کے پاس تو باپ کی نشانی ایک موٹر سائیکل تھا۔ چند ایک دوست تھے جو سول لائنز میں رہتے تھے۔ وہ بھلا کیا کالج والج جاتا!

اس سارے ماحول میں پروفیسر فخر کیچڑ کا کنول تھے۔

لمبے قد کے دُبلے پتلے پروفیسر ـــــ سیاہ آنکھیں جن میں تجسس اور شفقت کا ملا جلا رنگ تھا۔ انہیں دیکھ کر خدا جانے کیوں ریگستان کے گلہ بان یاد آ جاتے۔ وہ اُن لوگوں کی طرح تھے جن کے آدرش وقت کے ساتھ دھندلے نہیں پڑ جاتے ـــــ جو اس لیے محکمۂ تعلیم میں نہیں جاتے کہ اُن سے سی ایس پی کا امتحان پاس نہیں ہو سکتا یا وہ دولت کمانے کے کوئی بہتر گُر نہیں جانتے۔ انہوں نے تو تعلیم و تدریس کا پیشہ اس لیے چُنا تھا کہ انہیں نوجوانوں

کی پر تجسس آنکھیں پسند تھیں۔ انہیں فسٹ ایئر کے وہ لڑکے بہت اچھے لگتے تھے جو گاؤں سے آتے تھے اور آہستہ آہستہ شہر کے رنگ میں رنگے جاتے تھے۔ ان کے چہروں سے جو ذہانت ٹپکتی تھی، دھرتی کے قریب رہنے کی وجہ سے ان میں جو دو اور دو چار قسم کی عقل تھی پروفیسر فخر انہیں صیقل کرنے میں بڑا لطف حاصل کرتے تھے۔

وہ تعلیم کو میلاد النبیؐ کا فنکشن سمجھتے۔ جب گھر گھر دیے جلتے ہیں اور روشنی سے خوشی کی خوشبو آنے لگتی ہے۔ ان کے ساتھی پروفیسر جب سٹاف روم میں بیٹھ کر خالص HAVE - NOTS کے انداز میں نو دولتی سوسائٹی پر تبصرہ کرتے تو وہ خاموش رہتے کیونکہ ان کا مسلک لوئی پاسچر کا مسلک تھا۔ کولمبس کا مسلک تھا۔ ان کے دوست جب فسٹ کلاس، سیکنڈ کلاس اور سلیکشن گریڈ کی باتیں کرتے تو پروفیسر فخر منہ بند کیے اپنے ہاتھوں پر نگاہیں جما لیتے۔ وہ تو اس زمانے کی نشانیوں میں سے رہ گئے تھے جب شاگرد اپنے استاد کے برابر بیٹھ نہ سکتا تھا۔ جب استاد کے آشیر باد کے بغیر شانتی کا تصور بھی گناہ تھا۔ جب استاد خود کبھی حصولِ دولت کے لیے نہیں نکلتا تھا لیکن تاجدار اس کے سامنے دوزانو آ کر بیٹھا کرتے تھے۔ جب وہ شاہ جہانگیر کے دربار میں میاں میرؒ صاحب کی طرح کہتا کہ:

"اے شاہ! آج تو بلا لیا ہے پر اب شرطِ عنایت یہی ہے کہ پھر کبھی نہ بلانا۔"

جب استاد کہتا:

"اے حاکمِ وقت! سورج کی روشنی چھوڑ کر کھڑا ہو جا۔"

جب بی بی نے پہلی بار پروفیسر فخر کو دیکھا تھا تو فخر کی نظروں کا مجذوبانہ حسن شہد کی مکھیوں جیسا جذبۂ خدمت اور صوفیائے کرام جیسا اندازِ گفتگو اسے لے ڈوبا۔ بی بی ان لڑکیوں میں سے تھی جو درخت سے مشابہ ہوتی ہیں۔ درخت چاہے کیسا ہی آسمان کو چھونے لگے، بالآخر مٹی کے خزانوں کو نچوڑتا ہی رہتا ہے۔ وہ چاہے کتنا ہی چھتنارہ کیوں نہ ہو، بالآخر

اس کی جڑوں میں نیچے اتر تے رہنے کی ہوس باقی رہتی ہے ـــــ اور پھر پروفیسر کا آدرش کوئی ہانگے کا کپڑا تو تھا نہیں کہ مستعار لیا جاتا لیکن بی بی تو ہوا میں جھولنے والی ڈالیوں کی طرح یہی سوچتی رہی کہ اس کا دھرتی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ وہ ہوا پر زندہ رہ سکتی ہے۔ محبت ان کے لیے کافی ہے۔

تب اباجی زندہ تھے اور ان کے پاس شیشوں والی کار تھی جس روز وہ بی۔ اے کی ڈگری لے کر یونیورسٹی ہال سے نکلی تو اس کے اباجی ساتھ تھے۔ ان کی کار رش کی وجہ سے عجائب گھر کی طرف کھڑی تھی۔ مال کو کراس کر کے جب وہ دوسری جانب پہنچے تو فٹ پاتھ پر اس نے پروفیسر فخر کو دیکھا۔ وہ جھکے ہوئے اپنی سائیکل کا پیڈل ٹھیک کر رہے تھے۔

"سر سلام علیکم ـــــ!"

فخر نے سر اٹھایا اور ذہین آنکھوں میں مسکراہٹ آگئی۔

"وعلیکم السلام۔ مبارک ہو آپ کو ـــــ"

سیاہ گاؤن میں وہ اپنے آپ کو بہت معزز محسوس کر رہی تھی۔

"سر میں لے چلوں آپ کو ـــــ"

بڑی سادگی سے فخر نے سوال کیا۔ ـــــ "آپ سائیکل چلانا جانتی ہیں؟"

"سائیکل پر نہیں جی ـــــ میرا..... مطلب ہے کار کھڑی ہے جی میری"۔

فخر سیدھا کھڑا ہو گیا اور بی بی اس کے کندھے برابر نظر آنے لگی۔

"دیکھیے مس ـــــ استادوں کے لیے کاروں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کے شاگرد کاروں میں بیٹھ کر دنیا کا نظام چلاتے ہیں۔ استادوں کو دیکھ کر کار روکتے ہیں لیکن استاد شاگردوں کی کار میں کبھی نہیں بیٹھتا کیونکہ شاگرد سے اس کا رشتہ دنیاوی نہیں ہوتا۔ استاد کا آسائش سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ مرگ چھالا پر سوتا ہے۔ بڑ کے درخت تلے بیٹھتا اور جَو کی روٹی کھاتا ہے"۔

بی بی کو تو جیسے ہونٹوں پر بھڑ ڈس گئی۔
ابھی چند ثانیے پہلے وہ ہاتھوں میں ڈگری لے کر فُل سائز فوٹو کھنچوانے کا پروگرام بنا رہی تھی اور اب یہ گاؤن، یہ اونچا جوڑا، یہ ڈگری، سب کچھ نفرت انگیز بن گیا۔ جب مال روڈ پر ایک فوٹو گرافر کی دکان کے آگے کار روک کر اباجی نے کہا:
"ایک تو فُل سائز تصویر کھنچوالو اور ایک پورٹریٹ۔۔۔۔"
"ابھی نہیں اباجی! میں پرسوں اپنی دوستوں کے ساتھ مل کر تصویر کھنچواؤں گی۔"
"صبح کی بات پر ناراض ہو ابھی تک؟" اباجی نے سوال کیا۔
"نہیں جی وہ بات نہیں ہے۔"
صبح جب وہ یونیورسٹی جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی تو اباجی نے دبی زبان میں کہا تھا کہ وہ کنووکیشن کے بعد اسے فوٹو گرافر کے پاس نہ لے جاسکیں گے کیونکہ انہیں کمشنر سے ملنا تھا۔ اس بات پر بی بی نے منہ تھتھا لیا تھا ـــــ اور جب تک اباجی نے وعدہ نہیں کر لیا تب تک وہ کار میں سوار نہ ہوئی تھی۔
اب کار فوٹو گرافر کی دکان کے آگے کھڑی تھی۔ اباجی اس کی طرف کا دروازہ کھولے کھڑے تھے لیکن تصویر کھنچوانے کی تمنا آپ ہی آپ مر گئی تھی۔
بی اے کے بعد کالج کا ماحول دُور رہ گیا۔ یہ ملاقات بھی گرد آلود ہو گئی اور غالباً طاقِ نسیاں پر بھی دھری رہ جاتی اگر اچانک کتابوں کی دکان پر ایک دن اسے پروفیسر فخر نظر نہ آجاتے۔ وہ حسبِ معمول سفید قمیص خاکی پتلون میں ملبوس تھے۔ رومن نوز پر عینک ٹکی تھی اور وہ کسی کتاب کا غور سے مطالعہ کر رہے تھے۔ بی بی اپنی دو تین سہیلیوں کے ساتھ دکان میں داخل ہوئی ـــــ اسے ویمن ایٹ ہوم قسم کے رسالے درکار تھے۔ عید کارڈ اور سٹچ کرافٹ کے پمفلٹ خریدنے تھے۔ لو کیلری ڈائٹ قسم کی ایسی کتابوں کی تلاش تھی جو سالوں میں بڑھایا ہوا وزن ہفتوں میں گھٹا دینے کے مشورے جانتی ہیں لیکن اندر گھستے ہی گویا آئینے کا سامنا پڑا۔

"سلام علیکم سر ـــــ"

"وعلیکم السلام ـــ" مٹھو کے بھکشو نے جواب دیا۔

"آپ نے مجھے شاید پہچانا نہیں سر ـــــ میں آپ کی سٹوڈنٹ ہوں جی ـــ

قمر زبیری ـــ"

اس نے دوستوں کی طرف خفت سے دیکھ کر کہا۔

"میں نے تمہیں پہچان لیا ہے قمر بی بی ـــــ کیا کر رہی ہیں آپ ان دنوں؟"

"میں جی ـــــ کچھ نہیں جی ـــ سر!"

ایک سہیلی نے آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ دوسری نے کمر میں چٹکی کاٹی لیکن وہ تو اس طرح کھڑی تھی گویا کسی فلم سٹار کے آگے آٹوگراف لینے کھڑی ہو۔

"آپ ایم اے نہیں کر رہی ہیں پولیٹیکل سائنس میں؟"

"اس کی تو شادی ہو رہی ہے سر۔"

کھی کھی کر کے ساری کبوتر زادیاں ہنس دیں۔

بی بی نے قاتلانہ نظروں سے سب کو دیکھا اور بولی: "جھوٹ بولتی ہیں جی ـــ میں تو جی ایم اے کروں گی۔"

اب پروفیسر مکمل پروفیسر بن گیا۔ جوان چہرے پر بڑھاپے کی متانت آگئی۔

"دیکھیے۔ پڑھی لکھی لڑکیوں کا وہ رول نہیں ہے جو آجکل کی لڑکیاں ادا کر رہی ہیں۔ آپ کو شادی کے بعد یہ یاد رکھنا چاہیے کہ تعلیم سونے کا زیور نہیں ہے جسے بنک کے لاکر میں بند کر دیا جاتا ہے بلکہ یہ تو جادو کی وہ انگوٹھی ہے جسے جس قدر رگڑتے چلے جاؤ اسی قدر خوشیوں کے دروازے کھلتے جاتے ہیں۔ آپ کو اس تعلیم کی زکوٰۃ دینا ہوگی۔ اسے دوسروں کے ساتھ SHARE کرنا ہوگا۔"

بات بہت معمولی اور سادہ تھی۔ اس نوعیت کی باتیں عموماً عورتوں کے رسالوں میں چھپتی رہتی ہیں لیکن فخر کی آنکھوں میں، اس کی باتوں میں وہ حسن تھا جو ہمیشہ سچائی سے پیدا ہوتا ہے۔ جب وہ پمفلٹ اور وزن گھٹانے کی تین کتابیں خرید کر کار میں آ بیٹھی تو اس کی نظروں میں وہی چہرہ تھا۔ وہی بھیگی بھیگی آواز تھی۔

پروفیسر فخر کو دیکھنے کی کوئی صورت باقی نہ تھی لیکن اس کی آواز کی لہریں اسے ہر لحظہ زیرِ آب کیے دیتی تھیں۔ اٹھتے بیٹھتے، جاگتے سوتے، وہی شکاری کتے جیسا ستا ہوا چہرہ، اندر کو دھنسی ہوئی چمکدار آنکھیں اور خشک ہونٹ نظروں کے آگے گھومنے لگے۔ پھر یہ چہرہ بھلانے نہ بھولتا اور وہ اندر ہی اندر بل کھائی رسّی کی طرح مروڑی جاتی۔

ان ہی دنوں اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کرے گی۔ حالانکہ اس کے گھر والے ایک اچھے بر کی تلاش میں تھے۔ ہاتھی مرا ہوا بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ ڈپٹی کمشنر ریٹائرڈ ہو کر بھی اونچی پشت والی کرسی سے مشابہ ہوتا ہے۔ ابا جی کے مال و متاع کو گھن اندر سے گھن لگ چکا تھا لیکن حیثیت عرفی بہت تھی۔ نوکر چاکر کم ہو گئے تھے۔ سوشل لائف بھی پہلے سی نہ رہی تھی۔ فنکشنوں کے کارڈ بھی کم ہی آتے لیکن رشتے ڈی سی صاحب کی بیٹی کے چلے آ رہے تھے اور اعلیٰ سے اعلیٰ آ رہے تھے۔ اس کی امی گو پڑھی لکھی عورت نہ تھی لیکن بااثر بارسوخ خواتین کی صحبت نے اسے خوب صیقل کر دیا تھا۔ اس میں ایک ایسی خوش اعتمادی اور پُرکاری پیدا ہو گئی تھی کہ کالجوں کی پروفیسریں اس کے ہوتے ہوئے اپنے آپ کو کمتر سمجھا کرتیں۔

جس وقت بی بی نے پولیٹیکل سائنس کرنے پر ضد کی تو امی نے زبردست مخالفت کی ابا جی نے قدم قدم پر یہ اڑچن پیدا کی کہ جو لڑکی ہمیشہ پولیٹیکل سائنس میں کمزور رہی ہے وہ اس مضمون میں ایم اے کیونکر کرے گی۔ کئی گھنٹوں کی بحثوں کے بعد ابا جی اس بات پر رضامند ہو گئے کہ وہ پروفیسر سے ٹیوشن لے سکتی ہے۔